محمد حنیف ندوی

تأثرات

پاکستان بن جانے کے بعد اول درجے کی اہمیت کا مسئلہ جسے ہمیں حل کرنا چاہیئے تھا یہ تھا کہ ہمارے تہذیبی امتیازات کیا ہیں اور جس خطۂ ارض کو ہم ایک مثالی مملکت کی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں اس کو کن تمدنی خصوصیات کا حامل ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ تہذیب و تمدن کے خدوخال کو متعین کیے بغیر ہم کسی صورت میں بھی ایک ملت یا ایک قوم ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتے ——— یہی نہیں، اس اہم مسئلہ سے پہلوتہی خود پاکستان کی اس بنیاد اور اساس ہی کو خطرہ میں ڈال دینے کا باعث ہو سکتی ہے کہ جس کی بنا پر اسے حاصل کیا گیا ہے۔ کیونکہ اگر ہماری زندگی کے خانے متعین نہیں ہیں، اگر ہمارے لائحۂ عمل میں اسلامی روح اور اسلامی ہدایات کو واضح مقام میسر نہیں ہے۔ اور اگر ہمارا قافلۂ تہذیب و تمدن بغیر کچھ سوچے سمجھے اور منزل و نصب العین کی تعیین کیے، تقلید و نقال کے بل پر آگے بڑھ رہا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارا یہ دعویٰ بالکل کھوکھلا اور بے جان ہے کہ ملتِ اسلامیہ اپنا مخصوص رنگ روپ رکھتی ہے۔ اور یہ کہ پاکستان اسلامی اقدار و روایات کو فروغ دینے کی غرض سے قائم ہوا ہے۔

آج سے دس پندرہ برس پہلے اگر ہم نے اس مسئلہ کی اہمیتوں کا احساس کر لیا ہوتا تو اس سے نہ صرف مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم دنیا میں سربلند ہوتے اور ہمارے اس دعوی و تصور کو تقویت پہنچتی کہ ہم ایک منفرد قوم ہیں جس کا اپنا ایک کردار اور مزاج ہے، بلکہ ہماری صفوں میں وہ سیاسی استواری و اعتماد بھی پوری طرح رونما ہوتا جس کے فقدان پر آج ہم نوحہ خواں ہیں۔

تہذیب و ثقافت کے مسئلہ میں یہ مجرمانہ تغافل کیوں ہوا اور کن اسباب و عوامل کو اس کا

ذمہ دار ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ یہ ایک طویل داستان ہے جو مستقل فرصت و توجہ کی طالب ہے۔
اس وقت جو چیز ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ماضی کی کوتاہیوں سے تعرض کیے بنا اہلِ فکر اس مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لیں۔ اور پوری سنجیدگی کے ساتھ اس راہ کی مشکلات کا جائزہ لیں اور ان خطوط اور پیمانوں کی وضاحت کریں کہ جن کو ملحوظ رکھ کر ہم احیائے تہذیب اسلامی کے فرض سے سبکدوش ہو سکتے ہیں۔ نیز متعین طور پر قوم کو بتائیں کہ فکر و عمل کے کس کس میدان میں کیا قدم اٹھنا چاہیے اور کیا کیا کام ہونا چاہیے کہ جس سے ہماری تہذیب و تمدن کا نقشہ نکھر کر نظر و بصر کے سامنے آجائے۔

اس سلسلے میں پہلے ہی قدم پر ہم یہ کہہ دینا چاہتے ہیں کہ ہم عمرانیات کے بعض محققین کے اس تشاؤم پسندی (Pessimism) سے متفق نہیں ہیں کہ تہذیبیں دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتیں۔ یا وہ مذہب جو اپنی عمر طبعی گزار چکا ہے پھر سے دلوں اور ذہنوں پر اپنا تسلط و اقتدار قائم نہیں کر سکتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح ہم اس رجائیت (Optimism) کے بھی قائل نہیں ہیں کہ بغیر کسی جدوجہد اور دلچسپی کے صداقتیں خود بخود پھیلتی، ابھرتی اور فروغ حاصل کرتی رہتی ہیں۔ یہ دونوں نظریے غلط فہمی اور افراط و تفریط پر مبنی ہیں۔

توسط و اعتدال کی راہ یہ ہے کہ مختلف تہذیبی تصورات مٹتے ہرگز نہیں، صرف چولا بدلتے ہیں اور ان میں کے معقول عناصر کسی نہ کسی رنگ میں زندہ اور کارفرما رہتے ہیں۔ مثال کے لیے یورپ کی موجودہ تہذیب ہی کو لیجیے۔ کیا اس کی ٹیم ٹام اور ٹھاٹھ کا قصرِ رفیع لذتیت افادیت اور عقلیت کے سہ گونہ عناصر پر مبنی نہیں ہے۔ غالباً اس کا جواب ایجاب میں دیا جائے گا۔ اگر یہ تجزیہ صحیح ہے تو اس کو باقاعدہ آگے بڑھنا چاہیے۔ اس غرض کے لیے ہم آپ کو ڈیڑھ ہزار سال اور پیچھے ہٹ جانے کی زحمت دیں گے۔ ذرا غور سے دیکھیے اور اس سوال پر غور کیجیے کہ اس تہذیب نے یہ رنگ و روغن کہاں سے حاصل کیا۔ کیا بعینہ یہی خصوصیات یونانی تہذیب و تمدن کا نچوڑ نہیں ہیں۔ اور کیا یونانی تہذیب و تمدن کے عین مین یہی وہ قابلِ فہم زندہ اور فعال عناصر نہیں ہیں کہ جن سے اس کا عجیب و غریب ہیولیٰ تیار ہوا ہے۔ صرف ایک

اس مثال سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ عمرانیت کے ماہرین کی یہ رائے کس درجہ سطحیت لیے ہوئے ہے۔

دراصل یہ حضرات جب یہ کہتے ہیں کہ ہر ہر تہذیب کو شباب و کہولت کی منزلیں طے کر کے بہرحال موت سے ہمکنار ہونا ہے تو اس میں علم و عرفان کی استواریوں سے زیادہ ان کے ارادہ و خواہش کا اظہار ہوتا ہے اور اس سے ان کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ ان کی بڑھتی ہوئی خواہشات حیوانی پر کوئی قدغن عائد نہ کیا جائے اور تہذیب و تمدن کے نام سے جو منفعتیں جو جو لذتیں اور عیش و تنعم کی فراوانیاں وابستہ ہیں ان کو جوں کا توں قائم رہنے دیا جائے۔

تہذیب و تمدن کی بقا و حیات سے متعلق یہ ایک عام تجزیہ تھا۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے ہم پوری ذمہ داری کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس کے بارہ میں یہ کہنا کہ یہ ایک گزری ہوئی تہذیب ہے یا ایک ایسا تصورِ حیات ہے جو اپنی عمرِ طبعی بسر کر چکا ہے، سرے سے غلط ہے۔ یہ ایک زندہ حقیقت اور جیتا جاگتا تصورِ حیات ہے۔ اور باوجود الحاد و زندقہ کی بوقلمونیوں کے نہ تو اس کی گرفت سے ابھی تک ذہن و فکر کے گوشے آزاد ہو پائے ہیں اور نہ اس کی فیض رسانیوں کا سلسلہ ہی منقطع ہوا ہے۔ بات صرف یہ ہے کہ صدیوں کی ملوکیت سے اس کا معاشرہ افسوسناک ٹھہراؤ (Stagnation) کا شکار ہو گیا ہے۔ اور یہ خیر امت جو دوسروں کی رہنمائی و امامت کے لیے پیدا ہوئی تھی اور جسے سب سے آگے آگے رہنا تھا خود جمود، جہل اور انتشار و تفریق کا بدترین نمونہ بن کر رہ گئی ہے۔ اور اس کا علاج مایوسی یا قنوط نہیں بلکہ یہ ہے کہ اسے موجودہ ٹھہراؤ سے کس طرح نکالا جائے۔ اس میں حرکت و زندگی کی لہریں پیدا کی جائیں اور منزل و نصب العین کا شعور اس طرح بیدار کیا جائے کہ یہ دوبارہ اپنا مقام حاصل کر سکے دوسرے لفظوں میں اس کی راکھ سے کچھ شرارے کو تلاش کر کے اس طرح دہکایا جائے تاکہ یہ شرارے پھر سے شعلہ جوالہ کی شکل اختیار کر لیں۔

(باقی)